تواریخِ ادب میں اُردو کی ابتدا کے مباحث : تجزیہ اور تقابل

محمد اصغر، ریسرچ اسکالر، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

ڈاکٹر محمد خاور نوازش، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

Abstract:

Although the first constant history of Urdu literature Tareekh-e-adab-e-Urdu(1927) was written by Ram Babu Sexena in English and translated by Mirza Muhammad Askari just after two years but this development was actually initiated by Muhammad Hussain Azad. His book *Aab-e-Hayat(1880)* mostly known as 'tazkara' was first significant attempt to write literary history of Urdu. In this book, Azad tried to trace the history of Urdu language too. Following that, almost every historian of Urdu literature has written the first chapter of their book on this subject. In fact history of language is a different subject and it is related to the linguists. That is why besides some literary historians who actually are linguists like Masood Hussain Khan in *Aligarh Tareekh-e-Adab-e-Urdu(1962)* and Gyan Chand Jain in *Tareekh-e-adab-e-Urdu: 1700 tak (1998)*; no one has bothered to keep in view the principles of modern linguistics while writing the history of language. The majority of literary historians derive history of Urdu language from political history of India. Secondly, despite being historian they seem partial for their regional, racial and religious identity. This premise is under consideration in this research paper. The writings of fourteen renowned literary historians on the important subject of beginning of Urdu language have been analyzed and compared.

Key Words: History of Literature - Beginning - Urdu - Language - Hindi - Linguistics - Miscellaneous - Assimilation - Punjab - Delhi - Historian - Linguist - Khawar – Nawazish

تلخیص:

گو کہ اُردو ادب کی پہلی باقاعدہ تاریخ (۱۹۲۷ء) رام بابو سکسینہ نے انگریزی میں لکھی اور دو برس بعد مرزا محمد عسکری نے اسے اُردو میں ترجمہ کیا لیکن اس روایت کے بنیاد گزار اصل میں محمد حسین آزاد ہیں۔ اُن کی آبِ حیات جسے زیادہ تر تذکرہ سمجھا جاتا ہے اُردو ادب کی تاریخ لکھنے کی جانب پہلی اہم پیش رفت تھی۔ اس کتاب میں آزادؔ نے ادب

کی تاریخ سے پہلے زبان کی تاریخ کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کی۔ اس کے بعد یہ روایت مستحکم ہو گئی اور ہر مورخ اپنی تاریخِ ادب کا پہلا باب تاریخِ زبان کے لیے مختص کرنے لگا۔ دراصل تاریخِ زبان تاریخِ ادب سے مختلف اور مورخین سے زیادہ ماہرینِ لسانیات سے متعلق موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماسوائے چند مورخین کے جو اصلاً ماہرینِ لسانیات ہیں مثلاً مسعود حسین خان بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو (۱۹۶۲ء) اور گیان چند جین بحوالہ تاریخ ادب اُردو: ۱۷۰۰ء تک (۱۹۹۸ء)، کسی نے بھی زبان کی تاریخ لکھتے ہوئے جدید لسانیات کے اصولوں کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ ادبی مورخین کی اکثریت ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے ہی اُردو کی تاریخ کشید کرتی نظر آتی ہے۔ دوسرا وہ لوگ مورخ ہونے کے باوجود اپنے علاقائی، نسلی اور مذہبی تشخص کے حوالے سے جانبدار نظر آتے ہیں۔ یہی مفروضہ اس تحقیقی مقالے میں زیرِ بحث ہے۔ یہاں چودہ معتبر مورخینِ ادب کی اُردو زبان کی ابتدا کے موضوع پر تحریروں کا تجزیہ اور تقابل پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ:

تاریخِ ادب۔ ابتدا۔ آغاز۔ زبان۔ اردو۔ ہندی۔ لسانیات۔ مخلوط۔ اختلاط۔ پنجاب۔ دہلی۔ مورخ۔ ماہرِ لسانیات۔ خاور۔ نوازش

ماہرینِ لسانیات نے اُردو زبان کی ابتدا کے حوالے سے جو نظریات پیش کیے ہیں وہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں لیکن کیا اسے ستم ظریفی نہیں کہنا چاہیے کہ آج تک اُردو دنیا اپنی زبان کی ابتدا کے حوالے سے کسی ایک نظریے پر متفق نہیں ہو سکی۔ یوں تو ہر نظریہ مدلل بھی ہوتا ہے اور وضاحتی مثالوں پر مبنی بھی لیکن اس میں کوئی نہ کوئی ایسا جھول رہ جاتا ہے جو اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے سامنے نئے سوالات رکھتا ہے۔ پروفیسر سحر انصاری کے بقول دراصل ہمارے یہاں خان آرزو سے لے کر حافظ محمود شیرانی تک جو ماہرینِ لسانیات گزرے ہیں انھیں فلالوجسٹ (علم اللسان کے ماہرین) تو کہا جا سکتا ہے لیکن وہ جدید مفہوم میں ماہرینِ لسانیات نہیں ہیں۔ اس کی وجہ غالباً معیار بندی (Standardization) نہ ہونا ہے کہ جس کا جو جی چاہتا ہے وہ اپنے انداز میں تحریر کرتا چلا جاتا ہے[۱]۔ درس و تدریس سے منسلک محققین بھی طلبا کو جوں کا توں وہ سبق پڑھاتے رہتے ہیں۔ درحقیقت زبان کی ابتدا اور ارتقائی مراحل کی مختلف اشکال سے موجودہ شکل تک کی داستان ایسی پُرخار وادیٔ تحقیق اور موضوعِ بحث ہے کہ قدم قدم پر الجھانے والے سوالات سے سابقہ پڑتا ہے اور بسا اوقات اس داستان کا کوئی ایک پہلو کئی دنوں تک زیرِ بحث رہنے کے بعد بھی طلبا کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ابتدائے اُردو کے لسانی نظریات کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ ان سب نظریات کا مطالعہ زبانوں کے طالبعلموں کو چکرا دیتا ہے اور اس جنگل میں بعض اوقات راستہ بھول جانے کو جی چاہتا ہے[۲]۔ علم اللسان کے ہر ماہر کی

اپنی اپنی الف لیلیٰ ہے۔ کچھ کے ہاں کسی ایک بات پر اتفاق بھی ہے تو اس میں بھی انفرادیت کی گنجائش رکھنے کے لیے ایک الجھاؤ ضرور چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ تو علم اللسان کے ماہرین کی بات ہو گئی اب اگر مورخین کی طرف آئیں تو وہاں معاملہ نسبتاً زیادہ خراب ہے۔ مورخینِ ادب جب تاریخ لکھنے کا منصوبہ بناتے ہیں تو ادب سے پہلے زبان کی ابتدا اور ارتقا پر بھی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سلمان احمد لکھتے ہیں:

> "۔۔۔ادبی تاریخ میں زبان کی بحث بھی آ جاتی ہے۔ یعنی تاریخ نویس یہ بات ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ کوئی زبان کب اور کہاں پیدا ہوئی اور وہ کتنے متفرق ادوار سے گذری۔ حال آں کہ یہ کام ادبی تاریخ لکھنے والے کا نہیں بل کہ تاریخ زبان کے مورخ کا ہے لیکن اب یہ ایک رسم بن چکی ہے ہر تاریخ نویس اپنی ادبی تاریخ میں کچھ حصہ زبان سے متعلق بحث کے لیے مختص کر دیتا ہے۔"(۳)

اُردو ادب کی کم و بیش ہر معروف تاریخ میں پہلا باب اُردو زبان کی ابتدا کے موضوع پر ملتا ہے۔ تواریخِ ادب میں اس موضوع پر لکھے گئے ابواب کا مطالعہ کرتے ہوئے غور کیا جائے تو ایک دلچسپ نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ مورخین اپنے اپنے مخصوص جغرافیے میں قید ہیں۔ بالخصوص ایسی تواریخ جو تقسیمِ ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد لکھی گئی ہیں اور اُن کے لکھنے والوں کا تعلق پاکستان سے ہے تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ اُردو کی ابتدا کو اپنے مخصوص جغرافیے سے جوڑا جائے جبکہ ہندوستانی مورخین کی زیادہ تعداد اُردو کا ماخذ ہندوستان کی حدود میں تلاش کرنے پر زور دیتی ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ مورخین جو خود اہلِ زبان ہوں اُردو کی پیدائش کو بھی دہلی یا اترپردیش سے ہی منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انور سدید یا تبسم کاشمیری ایسے وہ مورخین جو خود اہلِ زبان نہیں بلکہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اُردو کا آغاز پنجاب سے تسلیم کرنے پر مصر نظر آتے ہیں۔ ان دونوں نکات سے قطع نظر تواریخِ ادب میں اس موضوع پر موجود مباحث کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- ایسے مباحث جن میں اُردو کی ابتدا کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی روشنی میں مختلف علاقوں سے جوڑا جاتا ہے یا جن ماہرینِ لسانیات نے اسے مختلف علاقوں سے جوڑا ہے ان سے اتفاق کیا گیا ہے۔
- ایسے مباحث جن میں مسلمانوں کی ہندوستان آمد اُردو کے آغاز کی بنیادی وجہ بتائی جاتی ہے۔ ایسے مباحث کے حامل مورخین عموماً اُردو کو باہر سے آنے والے مسلمانوں اور مقامی باشندوں کی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ بتاتے ہیں۔

- ایسے مباحث جن میں اُردو کی ابتداء کو ہند آریائی خاندان، پراکرت، اپ بھرنش، شورسینی اور کھڑی بولی سے جوڑا گیا ہے۔ اُن میں بنیادی اہمیت ذخیرۂ الفاظ سے زیادہ زبان کے صرفی و نحوی ڈھانچے کو دی جاتی ہے اور اُسی بنیاد پر زبان کے ماخذ کا تعین کیا جاتا ہے۔

پہلے دونوں زمروں کے مباحث جن مورخین کے ہاں ملتے ہیں اُن کا زبان کے بارے میں موقف کم و بیش ایک ایسا ہے۔ پہلے اُردو کے اُن مورخینِ ادب کی تحریروں سے رُجوع کرتے ہیں جو اُردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیتے ہیں یا اِس کی ابتدا کو مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے جوڑتے ہیں۔ تقسیمِ ہند سے پہلے الٰہ آباد یونیورسٹی کے نامور اُستاد سید اعجاز حسین (۱۸۹۸ء۔۱۹۷۵ء) کی مختصر تاریخ ادبِ اُردو ۱۹۳۴ء میں ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس تاریخ کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۰ء میں اُسی طرح چھپا لیکن تیسرا ایڈیشن سید اعجاز حسین نے کچھ ترامیم اور اضافوں کے بعد ۱۹۴۸ء میں ادارہ اشاعتِ اُردو لاہور (پاکستان) و حیدر آباد دکن سے شائع کرایا۔ پاکستان سے اس تاریخ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں اُردو اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا(۴)۔ اس کے پہلے باب میں جو اُردو کی ابتدا کے حوالے سے ہے فاضل مورخ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس کی ابتدا میں مسلمانوں کی ہندوستان آمد کو بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے اُن کی مراد شروع شروع میں تجارت کی غرض سے اور پھر سندھ کی طرف سے محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کا وُرود اور اس خطے پر قبضہ (۷۱۲ء) ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں جس میں اس موقف کا اظہار ملتا ہے:

> ”عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے باہمی اختلاط سے اس کا وجود ظہور میں آتا ہے۔ ہندوستان و عرب کا تعلق ظہورِ اسلام سے بھی پہلے کا ہے۔ تجارت کا سلسلہ عرصۂ دراز سے قائم تھا۔ لین دین میں کچھ یہاں کے الفاظ عرب جاتے ہوں گے اور وہاں کے الفاظ خواہ چیزوں کے نام ہی کیوں نہ ہوں ہندوستان آتے رہے ہوں گے۔۔۔ اس اختلاط کا زیادہ اثر اُس وقت ہوا جب عربوں نے ہندوستان میں سکونت شروع کی ہوگی اور اس میں زیادہ زور اس وقت پیدا ہوا ہوگا جب اہلِ عرب فاتحانہ انداز سے یہاں آکر رہنے لگے ہوں گے بالخصوص محمد بن قاسم کے زمانے سے۔“(۵)

چونکہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سندھ کے بعد مسلمانوں کے ڈیرے محمود غزنوی کے ساتھ پنجاب میں نظر آتے ہیں سو سید اعجاز حسین سمجھتے ہیں کہ الفاظ کا باہمی اختلاط ابتدائی طور پر سندھ اور بعد ازاں پنجاب میں ہوا اور پھر پنجابی کے صرفی و نحوی ڈھانچے پر اس اختلاط کا لبادہ چڑھ کر اُردو کی بنیاد بنا ہوگا تاہم اُردو زبان میں مزید نکھار اور روانی مسلمانوں کے دہلی

پہنچنے اور کھڑی بولی سے مل کر آئی۔ دوسرے لفظوں میں لسانی اختلاط کا دوسرا بڑا مرحلہ دہلی اور گردونواح میں طے ہوا۔اقتباس دیکھئے:

> ''سندھ اور پنجاب میں الفاظ کے ردوبدل سے اُردو کا ڈھانچہ تیار ہوتا رہا اور اس نے ایک صورت بھی اختیار کر لی تھی کہ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین نے پنجاب چھوڑ کر دہلی کو دارالسلطنت بنالیا اب یہاں آ کر ایک ترقی یافتہ صورت میں اُردو کو برج بھاشا کی صحبت نصیب ہوئی۔اس لئے یہ دہلی اور نواح دہلی مثلاً میرٹھ، سہارن پور، مظفر نگر وغیرہ میں ''کھڑی بولی'' کا دور دورہ تھا اس زبان سے مل کر اُردو میں لوچ اور روانی زیادہ ہوئی۔''(۶)

ایسے تمام مورخین جن کے لاشعور میں اُردو اور مسلمانیت کے رشتے کا ایقان جما ہوا ہے وہ حافظ محمود شیرانی کے نظریۂ ابتدائے اُردو سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔سید اعجاز حسین کا تعلق اسی قبیل سے ہے۔وہ اُردو کی بنیاد مسلمانوں کے ہندوستان میں داخلے کے تاریخی موڑ پر رکھتے ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ یا اُن کے فوراً بعد اس خطے میں صوفیاء کرام کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ متذکرہ تاریخ میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ملفوظات کو اُردو کے ابتدائی نمونوں کے حوالے سے اہم سمجھا گیا ہے اور پھر پنجاب سے اس زبان کے دہلی اور اس کے نواح میں پہنچنے کے بعد امیر خسرو اور کبیر داس کے کلام میں اس کے ابتدائی رُوپ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے حوالے سے سید محمد بن سید مبارک کرمانی کی تصنیف سیر الاولیا(مطبع محبِ ہند، دہلی، ۱۳۰۲ھ) بیشتر محققین کے اس بیان کا ماخذ ہے کہ خواجہ فرید کے کلام میں اُردو کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔مثال کے طور پر جواہرِ فریدی میں رقم ہے کہ خواجہ فرید جب اپنے مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو ایک دن وضو کروا رہے تھے تو انھوں نے بابا فرید کی آنکھ پر پٹی بندھی دیکھ کر پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ "آنکھ آئی ہے"(۷)۔ حافظ شیرانی نے بھی پنجاب میں اُردو میں دیگر کئی مثالوں کے ساتھ یہ واقعہ رقم کیا ہے(۸)۔اُردو کے مورخینِ ادب اور بالخصوص جو پنجاب سے اُردو کی ابتدا کے نظریے سے متفق ہیں نے اپنی تواریخ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ بیشتر نے حافظ شیرانی کی تقلید میں یا مولوی عبدالحق کی اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیا کرام کا کام سے پڑھ کر لکھا ہوگا۔اُردو زبان کی ترویج میں صوفیائے کرام کے گراں قدر کام سے کسی بھی مورخ نے انکار نہیں کیا لیکن اُردو کے ماخذ کا سوال بہر کیف مختلف موضوع ہے جس میں ایسی دوٹوک رائے قائم کرنا احتیاط کا متقاضی ہوگا کہ خواجہ فریدؒ یا اُن کے بعد کے کسی صوفی نے اس زبان کی بنیاد رکھی۔

ڈاکٹر سلیم اختر(پ:۱۹۳۴ء) کی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کو ادبیاتِ اُردو کے طلبا میں سب سے زیادہ مقبول تاریخ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یہ تاریخ پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے طبع ہوئی۔اس کے بعد سے اب تک

اس کے چالیس کے لگ بھگ ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارے موضوع یعنی اُردو کی ابتدا سے متعلق مواد پہلے تین ابواب' اُردو ہے جس کا نام'، 'اُردو زبان: آغاز کے بارے میں نظریات' اور 'اصلاحِ زبان' میں موجود ہے۔ زیرِ نظر مقالے کے آغاز میں ہی ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک مختصر اقتباس شامل کیا گیا ہے جس میں اختیار کردہ موقف کے عین مطابق فاضل مورخ نے متذکرہ تاریخ کو ادب کی تاریخ سمجھ کر ہی لکھا ہے اور اس میں زبان کی تاریخ لکھنے پر زیادہ توانائی صرف نہیں کی۔ زبان کی تاریخ پر انھوں نے دراصل ایک اور کتاب اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ لکھ رکھی ہے اور اُسی میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے بحث ملتی ہے۔ بہر کیف چونکہ ہمارا موضوع تواریخِ ادب میں اُردو کی ابتدا کے مباحث ہے سوا گر ہم ڈاکٹر سلیم اختر کی اول الذکر کتاب پر ہی توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ابتدائے اُردو کی بحث کا جائزہ لیں تو آشکار ہوگا کہ فاضل مورخ اُردو زبان کو گنگا جمنی تہذیب کی دین سمجھتے ہیں۔ سید اعجاز حسین کے برعکس انھوں نے اُردو کے مقامی خمیر پر زور دیا ہے۔ وہ اُردو کی بنیاد ہندوستان میں ہی تلاش کرنے کے حق میں نظر آتے ہیں اور اس ضمن میں 'ہندوی' کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ امیر خسرو نے بھی اپنی زبان کے لیے یہی نام استعمال کیا ہے(۹)۔ تاہم اُس ابتدائی زبان کے اُردو بننے تک کے عمل میں مسلمانوں کی ہندوستان آمد اور اُن کی زبانوں کے اثرات کا بڑا عمل دخل بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے متذکرہ تاریخ میں اُردو کے لیے مخلوط زبان کی اصطلاح تو استعمال نہیں کی لیکن بین السطور اس بات کا اظہار کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ دو مختصر اقتباسات ملاحظہ کریں:

> "ہمارے ہاں اردو کے آغاز، نام، ابتدائی نشو و نما کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لہٰذا تکرار اور اعادہ سے بچتے ہوئے اس امر پر زور دیا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان جس امتزاجی عمل کا ثمر ہے وہی اس کی اساسی صفت بھی ہے اور یہی امتزاجی عمل اُردو کو دیگر زبانوں سے ممتاز و ممیز بھی کرتا ہے۔"(۱۰)

> "زبان جب بن رہی ہو تو شاید اس عہد کی آبادی کو یہ شعور بھی نہ ہو کہ اس وقت کوئی زبان بننے کے عمل سے گزر رہی ہے اسے یوں سمجھئے کہ کیا اکبر کے عہد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ احساس ہوگا کہ ہماری باہمی ضروریات، لین دین اور میل ملاپ کے نتیجے میں ایک ایسی زبان صورت پذیر ہو رہی ہے جو مستقبل میں اس خطے کی تخلیقی وراثت کی امین ثابت ہوگی اور دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہوگی۔"(۱۱)

گویا ڈاکٹر سلیم اختر کے نزدیک اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ اور لسانی امتزاج کا نتیجہ ہے۔ اس نکتے پر ڈاکٹر سلیم اختر اور سید اعجاز حسین کا موقف یکساں ہے۔ سید اعجاز حسین نے بھی مسلمانوں کے دہلی جانے کے بعد عربی فارسی ترکی وغیرہ کے مقامی برج بھاشا اور کھڑی بولی سے اختلاط کا نتیجہ اُردو قرار دیا تھا۔

مورخینِ اُردوادب میں ڈاکٹر سلیم اختر کے بعد اُردو کو مخلوط زبان قرار دینے والوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی (پ:۱۹۲۸ء) بھی شامل ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کو اُردو کے تاریخ نویسوں میں سب سے بلند اور معتبر مقام حاصل ہے۔ان کی چار جلدوں پر محیط تاریخِ ادبِ اُردو صرف تاریخ نہیں بلکہ تحقیق اور تنقید کا بھی عمدہ نمونہ ہے۔ یہ تاریخ ادبیاتِ اُردو کے ہر محقق کے لیے مختلف موضوعات پر مستند معلومات کا ذخیرہ سمجھی جاسکتی ہے۔ تاریخِ ادبِ اُردو پہلی دفعہ ۱۹۷۷ء میں مجلس ترقی ادب لاہور اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی۔اس تاریخ کی جلد اول (قدیم دَور، آغاز سے ۱۷۵۰ء تک) کے آغاز پر ایک تمہید بعنوان 'اُردو زبان اور اُس کے پھیلنے کے اسباب' اور فصل اول بعنوان 'شمالی ہند (۱۰۵۰ء سے ۱۷۰۷ء)' ہمارے موضوع کے حوالے سے اہم ہیں۔ تمہید میں ہی ڈاکٹر جالبی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اُردو زبان کے ماخذ کی تلاش دراصل ماہرِ لسانیات کا کام ہے لیکن اس زبان کی موجودہ شکل کو دیکھتے ہوئے اسے مسلمانوں کی زبانوں اور ہندوستان کی زبانوں کا جدید مشترک رُوپ کہا جاسکتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

> " اس زبان کا کپڑا کس دھاگے سے بُنا گیا تھا یہ دھاگا کس علاقے کو روئی سے تیار ہوا تھااور یہ روئی کس کھیت سے پیدا ہوئی تھی، یہ بات ماہر لسانیات پر چھوڑ کر ہمارے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ یہ سب کے منہ چڑھی زبان جسے آج ہم اُردو کے نام سے پکارتے ہیں جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور "عربی، ایرانی، ہندی" تینوں تہذیبوں کا سنگم اور اُن کی منفرد علامت ہے۔"(۱۲)

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اُردو کو ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبان مانتے ہیں گویا وہ بھی ڈاکٹر سلیم اختر سے اتفاق کرتے ہوئے اُردو زبان کی ہندوستانی بنیاد پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے ابتدائی ہیولی کی تیاری کا سہرا سندھ وملتان کے سر باندھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی شواہد کی روشنی میں مسلمانوں کی اس خطے میں آمد کو ہی اُردو کی تشکیل سازی کی اساس سمجھتے ہیں۔ لسانی اختلاط پر ڈاکٹر جمیل جالبی بھی یقین رکھتے ہیں۔اقتباس دیکھئے:

> "مسلمانوں کے ساتھ جہاں جہاں یہ زبان پہنچی وہاں وہاں علاقائی اثرات کو جذب کر کے اپنی شکل بناتی رہی۔اس کا ایک ہیولی سندھ وملتان میں تیار ہوا۔ یہاں سے تقریباً دو صدی بعد یہ دہلی پہنچا اور وہاں کی زبانوں کو جذب کر کے اور ان میں جذب ہو کر سارے برعظیم میں پھیل گیا۔۔۔ مختلف زبانوں سے اس کا یہ تعلق اور مختلف زبانوں کے علاقوں کا اس زبان پر دعویٰ

اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے سب سے فیض اُٹھا کر اپنے وجود کو انفرادیت بخشی ہے۔"(۱۳)

اسی طرح کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں مسلمانوں کی ہندوستان آمد کو نہ صرف [ایک مخلوط زبان] اُردو کی تشکیل بلکہ ہندوستانی زندگی میں تہذیب کے آغاز سے بھی جوڑا گیا ہے:

" جہاں جہاں مسلمان پھیلتے گئے زندگی کی گہما گہمی اور تہذیب کا آغاز ہوتا گیا۔ پہلے یہ عمل سندھ و ملتان میں ہوا، پھر پھیل کر سرحد، پنجاب اور میرٹھ و نواح دہلی تک پہنچ گیا اور قطب الدین ایبک سے لودھیوں تک آتے آتے تہذیبی و لسانی سطح پر یہ اثرات اتنے واضح ہو گئے کہ زبان اور تہذیب دونوں کو نئے سانچے میں ڈھال کر ایک الگ رنگ روپ دے دیا ۔اِسی کے ساتھ ساتھ ایک مشترک زبان کے خدوخال بھی اُجاگر ہوتے گئے۔"(۱۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی چونکہ بنیادی طور پر ایک مورخ اور نقاد ہیں اس لیے وہ برصغیر میں سیاسی تاریخ کے بہاؤ سے ہی زیادہ متاثر ہیں اور اسی کی بنیاد پر تمام نتائج اخذ کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کی اس خطے میں آمد کو ہی بہر صورت ایسا موڑ سمجھنا کہ جس سے یہاں تہذیب یا زندگی کی گہما گہمی کا آغاز ہوا درست نہیں۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی ہندوستان آباد تھا، خوش حال بھی تھا، یہاں کی اپنی ایک تہذیب تھی، زندگی کی گہما گہمی تھی، یہاں زبانیں بھی موجود تھیں بلکہ جس زبان سے اُردو ارتقاپذیر ہوئی وہ باقاعدہ شمالی ہند میں لنگوافرانکا کی حیثیت رکھتی تھی۔ مسلمانوں کے آنے سے ہند مسلم تہذیب کی بنیاد پڑھنے کی گنجائش نکلتی ہے جو ظاہر ہے کسی نہ کسی صورت میں آج بھی ہندوستان کی روزمرہ زندگی میں نظر آتی ہے۔ جہاں تک اُردو کے ماخذ کا تعلق ہے تو دیگر مورخینِ ادب کی طرح جالبی صاحب کے اُردو کو مخلوط کہہ دینے یا اس کے ماخذ کو مخلوط زبان کہہ دینے میں یہ منطق نظر آتی ہے کہ اُن کی بات خواہ لسانی اصولوں کی روشنی میں درست تسلیم نہ ہو لیکن یکسر غلط بھی قرار نہ پائے۔ ایک زبان بہر کیف کسی نہ کسی دوسری زبان یا اُس کی موہوم سی شکل سے ہی ارتقاپذیر ہوتی ہے چاہے وہ شکل کسی رنگین تصویر میں ہی موجود ہو۔تاریخِ ادبِ اُردو کی متذکرہ تمہید میں ہی آگے چل کر جالبی صاحب نے اُردو کا ماخذ شورسینی اَپ بھرنش کو قرار دیا ہے لیکن اُس ماخذ کے لیے بھی 'کھچڑی زبان' کی اصطلاح استعمال کی ہے جو اُن کے خیال میں پورے ہندوستان کی لنگوافرانکا تھی (۱۵)۔

جالبی صاحب کے بعد مورخینِ اُردو ادب میں ایک اور اہم نام ڈاکٹر انور سدید (۱۹۲۸ء۔۲۰۱۶ء) کا ہے۔اُن کی کتاب اُردو ادب کی مختصر تاریخ پہلی دفعہ ۱۹۹۱ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہوئی۔اب تک اس کے دس ایڈیشنز منظرِ عام پر آچکے ہیں۔اُردو کے ادبی حلقوں میں گو کہ یہ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تواریخ ایسی معروف تاریخ نہیں

ہے لیکن انور سدید کی علمی شہرت کے سبب اس کی اپنی قدر ہے۔اس تاریخ کا باب اول 'اُردو زبان کی ابتدا' کے عنوان سے ہے جس میں انور سدید نے مختلف ماہرینِ لسانیات جن میں حافظ شیرانی، مسعود حسین خان اور شوکت سبزواری شامل ہیں کے نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اُردو کی ابتدا سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔انور سدید نے بھی اپنے پیش رووں کی طرح اُردو کو واضح الفاظ میں ایک مخلوط زبان قرار دیا ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

"جب مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی اور اس قوم نے شمال میں طویل قیام کے بعد جنوب کی طرف پیش قدمی کی تو مقامی زبان کے ذخیرے میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کا خاطر اضافہ ہوا۔اس کی نئی مخلوط صورت کو مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا۔یہ زبان اُردو تھی جس کی خام صورت سندھ اور پنجاب میں مرتب ہوئی۔"(۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انور سدید نے اُردو کو مسلمانوں کی آمد کے بعد مقامی ہندوستانی بولیوں میں عربی فارسی اور ترکی الفاظ کے اضافے کے بعد ابھرنے والی مخلوط زبان سمجھا ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن نقوی کا شمار بھی مورخین کے اس گروہ میں ہوتا ہے جن کے خیال میں جب مختلف قومیں آپس میں ملتی ہیں تو اُن کی زبانوں کے باہمی لین دین سے ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے[۱۷]۔اُن کی کتاب تاریخِ ادبِ اُردو پہلی دفعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی۔کتاب کا آغاز پر 'اردو زبان کا آغاز وارتقاء' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے جس میں انھوں نے اختلاطِ لسان کو ہی کسی نئی زبان کی بنیاد پڑنے کا قاعدہ قرار دیا ہے۔نورالحسن نقوی چونکہ ماہرِ لسانیات نہیں ہیں اس لیے اُن کا موقف بھی دیگر مورخینِ ادب کی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے سکنی بہاؤ سے متاثرہ ہے۔اُردو کے آغاز کے حوالے سے اُن کا نقطۂ نظر ملاحظہ کیجیے:

"دوآبہ شورسینی پراکرت کا علاقہ تھا جلد ہی اس نے شورسینی اپ بھرنش کا روپ اختیار کر لیا اور دو سو برس کے اندر پورے شمالی ہندوستان پر چھا گئی چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں مسلمان بڑی تعداد میں شمالی ہندوستان پہنچے تو یہاں اسی زبان کو دور دورہ تھا۔اس زبان کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے اسے ہندوستانی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے مسلمان اپنے ساتھ فارسی، عربی الفاظ لائے جو اس میں یعنی کھڑی بولی یا ہندوستان میں داخل ہونے لگے جس کے نتیجے میں اردو زبان وجود میں آئی۔"(۱۸)

مندرجہ بالا بیان میں نورالحسن نقوی نے کھڑی بولی اور شورسینی کے فرق کا کچھ لحاظ نہیں رکھا حالانکہ ان دونوں میں زمانی فرق کم از کم بھی دو سو سے چار سو سال کا ضرور ہے۔ایک اور اقتباس دیکھئے:

"مسلمانوں کے قافلے یکے بعد دیگرے افغانستان کے راستے سے پنجاب اور پنجاب سے دہلی پہنچتے تھے اور مقامی باشندوں سے ان کے میل جول سے اس نئی زبان کی عمارت اٹھتی چلی جاتی تھی۔اس نئی زبان کو پہلے ہندی، ہندوی، ریختہ وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا گیا پھر اسی نے اردو نام پایا۔"(۱۹)

گویا اس تاریخِ ادب کا مصنف بھی اُردو زبان کو مقامی و غیر ملکی زبان کے اختلاط سے بننے والی زبان سمجھنے پر مصر ہے اور اس کی بنیاد مسلمانوں کی باہر سے ہندوستان میں آمد کو قرار دیتا ہے۔

ایک اور معروف تاریخ تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند ہے۔ یہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا ایک پراجیکٹ تھا جو اسی نام سے قائم ہوئے ایک مکمل شعبے کی نگرانی میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۸ء تک جاری رہا۔اس کے تحت برصغیر میں عربی، فارسی، اردو، بنگالی اور معروف علاقائی زبانوں کی ادبی اور تہذیبی تواریخ کا کام چودہ جلدوں میں مکمل کرایا گیا۔۲۰۰۸ء میں اس شعبے کو دوبارہ زندہ کر کے نامور محقق ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی نگرانی میں تمام جلدوں کے نظرثانی شدہ ایڈیشنز تیار کرنے پر کام شروع ہوا۔اس منصوبے کے تحت اُردو ادب کی تاریخ کی اب تک چھ جلدیں نظرثانی کے بعد منظرِ عام پر آچکی ہیں۔تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند (اُردو ادب) کی جلد اول جو آغاز سے معاصرینِ ولی تک کے عہد کی تاریخ ہے نظرثانی کے بعد ۲۰۰۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور نے شائع کی۔اس کا باب دوم 'اُردو کی پیدائش وارتقا' کے عنوان سے ہے اور اس کے مصنف ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (۱۹۲۴ء۔۲۰۰۷ء) ہیں۔وہ کوئی باقاعدہ مورخ تو نہیں ہیں لیکن اُردو زبان کی تاریخ پر یہ باب لکھ کر بہر کیف وہ ہمارے موضوع کی مناسبت سے اس دائرے میں شامل ہو گئے ہیں اور چونکہ متذکرہ تاریخ کی بھی بہر کیف اپنی ایک اہمیت ہے اس لیے اسے زیرِ بحث آنا چاہیے۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اُردو کی ابتدا پر لکھتے ہوئے دیگر مورخین کی طرح اُردو زبان کو مخلوط زبان سمجھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"لاطینی زبان جب فرانس میں پہنچی تو مدت کے بعد فرانسیسی، ہسپانیہ میں ہسپانوی بلکہ خود اطالیہ میں اطالوی بن گئی۔ تعجب نہیں اگر برصغیر میں بھی یہی صورت ظہور پذیر ہو گئی ہو اور اردو جیسی مخلوط زبان فقط لسانی اختلاط سے وجود میں آگئی ہو۔"(۲۰)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مندرجہ بالا سطور میں نہ صرف یہ کہ اُردو کے مخلوط ہونے کی کوئی مضبوط دلیل پیش نہیں کر سکے بلکہ آگے چل کر اپنی ہی بات کی نفی بھی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"تجارتی رابطے سے کچھ الفاظ کا لین دین تو ہوتا ہے لیکن زبان کا صرفی و نحوی نظام اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ پھر یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ جنوبی ہند دراوڑی زبانوں کا مرکز اور

عربی ایک سامی النسل زبان ہے، جبکہ اُردو کا تعلق آریائی خاندان سے ہے۔ابتدائی فاتحین عرب تھے جن کے خاندان یہاں آباد گئے تھے۔نویں صدی عیسوی میں جب ایران میں صفاریوں کااقتدار قائم ہواتوایرانی اثرات سندھ اور ملتان میں بھی ہوئے۔اس عرصے میں کچھ عربی، فارسی الفاظ کا انجذاب مقامی میں ضرور ہوا ہو گا۔تاہم اس سے کسی نئی زبان کی ابتدا کا قیاس درست نہیں ہو گا۔"(۲۱)

یہ بات جدید لسانیاتی اصولوں کے عین مطابق ہے کہ جن زبانوں کا تعلق مختلف خاندانوں اور نسلوں سے ہو ان میں تجارتی روابط کی بناپر الفاظ کے لین دین سے نئی زبان کی بنیاد نہیں پڑ سکتی تاہم پہلے سے موجود کسی صرفی و نحوی ڈھانچے میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہو سکتے ہیں۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند کے اس باب میں اُردو کی ابتدا کے حوالے سے مختلف ماہرینِ لسانیات کے نظریات سے تفصیلاً بحث کی ہے اور اس بحث کے بعد اُردو کی ابتدا کے حوالے سے اُن کا جھکاؤ واضح طور پر حافظ محمود شیرانی کے نظریے یعنی پنجاب سے اس زبان کا آغاز ہونے کی طرف ہے۔دوسرا اختصاص اُن کا یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی طرح مسلمانوں کی ہندوستان آمد کو اُردو کی تشکیل کا بڑا محرک تو سمجھتے ہیں لیکن اُردو کو جدید ہند آریائی یعنی خالصتاً ہندوستانی زبان قرار دیتے ہیں۔

یہاں تک ہم اُردو کے اُن چھ مورخین کی تواریخِ ادب میں اُردو کی ابتدا کے مباحث کا جائزہ لے چکے ہیں جنھوں نے اُردو کے لسانی ڈھانچے سے زیادہ برصغیر کی سیاسی تاریخ پر ذہن مرکوز رکھا۔ان مورخین نے اُردو کے عربی فارسی اور ترکی ذخیرۂ الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس زبان کی بنیاد مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے ہی پڑی اور چونکہ مسلمان پنجاب اور سندھ کے راستے ہندوستان آئے سو اُردو کا ماخذ انھی علاقوں میں تلاش کرنا چاہیے۔یہی نہیں بلکہ ان سب مورخین نے اُردو کے لیے ایک مخلوط زبان کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔جدید ماہرینِ لسانیات لسانی اختلاط کے نظریے پر سب سے زیادہ تنقید کرتے ہیں۔مسعود حسین خان، شوکت سبزواری، گیان چند جین اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کا خیال ہے کہ زبان اپنے ارتقا کے مختلف ادوار میں مختلف اسباب کی بناپر نئے اسالیب یا نئے رُوپ تو اختیار کر سکتی ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کسی دوسری زبان سے اختلاط کے نتیجے میں ایک نئی زبان کا بیج بوئے۔اب ہم اُن مورخینِ ادب کی طرف آتے ہیں جنھوں نے اُردو کا ماخذ مقامی بولیوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد حسین آزادؔ (۱۸۳۲ء۔۱۹۱۰ء) کو ہم باقاعدہ طور پر مورخ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن اُن کی آبِ حیات (۱۸۸۰ء) کو اُردو تاریخ نویسی کا آغاز ہی سمجھا جاتا ہے۔آبِ حیات پر تذکرے کا رنگ حاوی ہونے کے باوجود اس میں تاریخ کی جھلک نمایاں ہے۔آزادؔ بھی کوئی ماہرِ لسانیات نہیں تھے لیکن انھوں نے آبِ حیات کے دیباچے میں اُردو کے آغاز

کے حوالے سے جو چند باتیں کیں وہ آنے والے وقتوں کے کئی مورخین کو متاثر کرتی رہیں اور ایک وقت تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ اُردو برج بھاشا سے ہی نکلی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ حامد حسن قادری (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۴ء) نے آزاد کی آبِ حیات کے ساٹھ برس بعد بھی داستانِ تاریخِ اُردو میں اُردو کا ماخذ برج بھاشا کو ہی سمجھا ہے۔ آزاد کے دو بیانات ملاحظہ کریں:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔۔۔ تم خیال کرو گے کہ شاید اس میراث قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہو گی اور وہ ایسا بیج ہو گا کہ یہیں پھوٹا ہو گا (اس ملک کے) اصلی باشندے اور لوگ تھے، ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ کل ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس قوم کا نام ایرین تھا۔" (۲۲)

"اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے لیکن اتنا یاد دلانا واجب ہے کہ اُردو کہاں سے نکلی ہے اور کیوں کر نکلی ہے۔ اُردو زبان اوّل لین دین، نشست برخاست کی ضرورتوں کے لیے پیدا ہوئی۔ ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے ہندوستان کو اپنا وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔" (۲۳)

محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے باطل ثابت ہو چکا ہے لیکن اس حوالے سے آزاد کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے کہ وہ پہلے محقق اور مورخ ہیں جنھوں نے ۱۸۸۰ء میں اُردو کا ماخذ ہندوستان میں ہی تلاش کرنے کا اشارہ دیا۔ دوسرا انھوں نے (فارسی چھوڑ کر) اِس زبان کو اپنی زبان کے طور پر اختیار کر لینے والے اُن مسلمانوں کی بات کی ہے جو ایرانی یا ترک تھے۔ گویا آزاد کے ہاں ہر طرح سے اُردو کی مقامیت پر ہی زور دیا گیا ہے۔ آزاد کے نظریے کو لگ بھگ ساٹھ برس بعد حامد حسن قادری نے داستانِ تاریخِ اُردو میں ایک دفعہ پھر سے اُٹھایا اور اُردو کا ماخذ برج بھاشا کو ہی قرار دیا۔ داستانِ تاریخِ اُردو پہلی دفعہ ۱۹۴۱ء میں لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ سے طبع ہوئی جبکہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں عزیزی پریس آگرہ نے شائع کیا۔ حامد حسن قادری کا ذکر محمد حسین آزاد کے ساتھ صرف اس نسبت سے کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے اُردو کی ابتدا کے حوالے سے آزاد کے نظریے کو قبول کیا وگرنہ اُن کا شمار بھی اُردو کو واضح الفاظ میں باہر سے آئیں عربی، فارسی، ترکی اور مقامی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ سمجھنے والوں میں ہوتا ہے۔ داستانِ تاریخِ اُردو میں وہ لکھتے ہیں:

" مسلمان (عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور اہل ہند کے ساتھ تمدن و معاشرت لین دین، شادی بیاہ ہر قسم کے تعلقات پیدا کئے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے برج بھاشا کے الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کئے اور اہل ہند نے عربی

، فارسی، ترکی، زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کئے اس طرح اردو زبان بننی شروع ہو گی۔"(۲۴)

"برج بھاشا اردو کی ماں ہے۔ فارسی و عربی کو اردو کی اصل سمجھنا غلطی ہے یہ اتفاق تھا کہ ہندوستان میں غیر ملک سے آنے والے سب سے پہلے مسلمان تھے اور ان کی زبانوں کی آمیزش سے برج بھاشا سے اردو پیدا ہوئی۔"(۲۵)

"نئی مخلوط زبان (اردو) کو آہستہ آہستہ ترقی ملتی رہی۔ مسلمان ابتک اپنی بول چال خط و کتابت وغیرہ کے لئے فارسی زبان ہی سے کام لیتے تھے لیکن بوقت ضرورت اہل ہند کے ساتھ نئی مخلوط زبان (اردو) میں معاملہ کرتے تھے۔"(۲۶)

آزاد کے بعد رام بابو سکسینہ (۱۸۹۵ء۔۱۹۵۷ء) نے واضح انداز میں اور کھل کر اُردو زبان کی مقامی ہندوستانی بنیاد پر زور دیا۔ یوں بھی انھیں اُردو ادب کا پہلا باقاعدہ مورخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی ہسٹری آف اُردو لٹریچر ۱۹۲۷ء میں الٰہ آباد سے شائع ہوئی جبکہ اس کا اُردو ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا ہے جو تاریخِ ادبِ اُردو کے نام سے پہلی بار ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا(۲۷)۔ تاریخِ ادبِ اُردو کے پہلے باب بعنوان 'زبانِ اُردو اور اس کی اصل' میں رام بابو سکسینہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اُردو کا اصل ماخذ مسلمانوں کے فتحِ دہلی (۱۱۹۳ء) کے وقت دہلی اور میرٹھ کے گردونواح میں بولی جانے والی زبان ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور مغربی ہندی اسی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی اور مندرجہ ذیل زبانیں اس کی شاخیں ہیں یعنی بنگارو، برج بھاشا، قنوجی اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی۔"(۲۸)

رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ کے متذکرہ پہلے باب میں اُردو اور ہندی پر قومیت کا لیبل لگانے والوں کی غلط فہمی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اُردو کی فارسیت کو دیکھ کر اسے مسلمانوں کی زبان سمجھنا اور ہندوؤں کے لیے مخصوص ہندی کا رواج دیا جانا سراسر غلط ہے اور یہ کہ اُردو کی ماں وہی مغربی ہندی ہے جو ہندوستان کے مرکز دہلی اور اس کے گردونواح میں رائج تھی۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ بہت مقبول ہوئی۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو شعبہ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک منصوبہ تھا جس کا آغاز ۱۹۵۶ء میں صدرِ شعبہ رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء) کی نگرانی میں ہوا۔ اس تاریخ کی پہلی جلد جو ۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک کی ادبی روایت کا احاطہ کرتی ہے ۱۹۶۲ء میں پروفیسر آلِ

احمد سرور (۱۹۱۱ء۔۲۰۰۲ء) کی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شائع کی۔ اس تاریخ اور پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہونے والی تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند میں یہ پہلو مشترک ہے کہ یہ دونوں مختلف مضمون نگاروں نے مل کر لکھی ہیں۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے آغاز میں ہی ایک 'لسانیاتی مقدمہ' دیا گیا ہے جو اُردو زبان کے پس منظر، لسانی تشکیل اور ارتقا کے موضوع پر ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر مسعود حسین خان (۱۹۱۹ء۔۲۰۱۰ء) ہیں۔ یہ مقدمہ واقعتاً ایک ماہر لسانیات کی تحریر ہے۔ آغاز میں ہی مسعود حسین خان نے واضح کر دیا ہے کہ اُردو زبان کی داستان اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک ہم اس کے دورخی ارتقا کا جائزہ نہ لیں[۲۹]۔ دورُخی سے اُن کی مراد ہند آریائی کا ارتقا عوامی بول چال کی سطح اور ادبی یا شستہ زبان کی صورت میں الگ الگ ہے۔ یہ بڑا سادہ سا اُصول ہے کہ جب بھی کسی عام بول چال کی زبان کو قواعد کی بیڑیاں پہنا کر ادبی زبان بنایا جاتا ہے تو وہ عوام سے دُور ہونے لگتی ہے اور مقامی نمایاں اثرات کی حامل بولی عوام میں باقی رہتی ہے۔ ہند آریائی کے ارتقا میں پراکرتوں اور اُپ بھرنشوں کے ظہور کی یہی صورت تھی۔ مسعود حسین خان نے اُردو اور ہندی کا ماخذ مغربی ہندی شاخ کی جس کھڑی بولی (ہندوستانی) کو قرار دیا ہے وہ شورسینی اُپ بھرنش سے ہی ارتقا یافتہ ہے[۳۰]۔ مغربی ہندی کے حوالے سے پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ اسے چند ماہرینِ لسانیات نے گریریسن کی اختراع قرار دیا ہے اور یہ دراصل کوئی زبان نہیں تھی۔ یہ بات بالکل درست ہے لیکن ہندی زبانوں کی جس شاخ کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اُس کے لیے کوئی اور نام بھی موجود نہیں۔ مسعود حسین خان نے متذکرہ 'لسانیاتی مقدمہ' میں اُردو کی ابتدا کے دو پہلوؤں یعنی مقامی ماخذ کھڑی بولی کے طلوع اور پھر اُس میں عربی، فارسی، ترکی الفاظ کی آمیزش سے الگ الگ بحث کی ہے۔ اس بحث سے چند اقتباسات دیکھیے:

> "جہاں تک ''سیاسی واقعات'' کا تعلق ہے تاریخ سے کوئی ایسی سند نہیں ملتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ شہر دہلی اور اس کے نواح میں پنجابیوں کا زور رہا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ایک مرتبہ پایۂ تخت قرار پا جانے کے بعد سیاسی اور لسانی لہریں دہلی سے پنجاب کی طرف جاتی رہی ہیں۔" (۳۱)

> "خسرو کا بیک وقت ''زبانِ دہلوی'' اور ''زبانِ لاہوری'' کا ذکر کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ دونوں زبانوں میں امتیاز بھی کرتے ہیں۔۔۔ خسرو کا زمانہ اولین سلاطینِ دہلی کا عہد ہے۔ اگر اردو پنجاب سے سفر کرتی ہوئی دہلی پہنچی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پون صدی کے اندر اندر اس میں اتنے حیرت انگیز انقلابات ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی اصل (زبان لاہوری) سے بالکل مختلف نظر آنے لگتی ہے۔" (۳۲)

"خسرو کی تقسیمِ زبان سے جس لسانیاتی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے: مسلمان پنجاب سے فارسی آمیز جدید پنجابی بولتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے ہیں۔ دہلی اور اس کے اطراف میں ان کی مڈ بھیڑ کئی بولیوں سے ہوتی ہے۔ اُس آس پاس کے علاقوں میں ہریانی اور کھڑی بولی کی قدیم شکلیں رائج ہوں گی۔ چونکہ کسی قدیم زمانے میں مشرقی پنجابی خود انہی دو بولیوں کے زیرِ اثر پیدا ہوئی تھی اس لیے پنجابی بولنے والوں کو برج بھاشا کی نسبت کھڑی اور ہریانی اپنی زبان سے زیادہ قریب نظر آتی ہیں۔ اس لیے اُن کی نظرِ انتخاب غیر شعوری طور پر برج کے مقابلے میں ان بولیوں پر پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے اور جس کی ابتدائی شکل کو انھوں نے اپنی لغت اور محاورے سے متاثر بھی کیا۔ اس خام اور غیر متعین زبان کو لے کر وہ خلجیوں کی قیادت میں دکن کا رخ کرتے ہیں جہاں کچھ عرصے کے بعد زبانوں کے اجنبی ماحول میں اس کا اپنا معیار متعین ہو جاتا ہے۔"(۳۳)

مسعود حسین خان نے ان تاریخی حوالوں کے علاوہ اُردو زبان کے صرف و نحو سے بھی اس لسانیاتی مقدمے میں بحث کی ہے۔ مسعود حسین خان کا علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے متذکرہ باب میں اُردو کے آغاز اور ارتقا کے حوالے سے موقف اب تک زیرِ بحث آنے والی تمام تواریخ سے زیادہ جامع اور لسانیاتی اعتبار سے نسبتاً قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں مسعود حسین خان اور حافظ شیرانی کے نظریے کا ہی زیادہ تقابل کیا جاتا رہا ہے کیونکہ دونوں نظریات لسانیاتی اور تاریخی شواہد کو بیک وقت حوالہ بناتے ہیں۔ عموماً اہلِ زبان مورخینِ ادب اور محققین نے مسعود حسین خان کے نظریے کو زیادہ اہمیت دی ہے جبکہ غیر دہلوی ادیبوں کے خیال میں حافظ محمود شیرانی کی بات زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے اسی لیے علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی تمہید میں لکھا کہ ہمارے یہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر علاقائی پاسداری کا عنصر حاوی نظر آتا ہے، دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ زبان نے پنجاب، بہار اور دکن کے کارناموں کے ساتھ جبکہ پنجاب، بہار، میسور، مدراس یا بنگال میں اُردو کی تاریخ لکھنے والوں نے دہلی اور لکھنؤ کے حوالے سے قابلِ قدر مواد دینے کے باوجود وہاں کی ادبی تواریخ و روایات کے ساتھ انصاف نہیں کیا(۳۴)۔

بیسویں صدی میں اُردو ادب کی جتنی بھی معروف تواریخ منظرِ عام پر آئیں اُن سب میں سے ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تاریخ ادبِ اُردو ابلاغ کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔ گو کہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے مضمون بعنوان 'تاریخ ادبِ اُردو (ڈاکٹر ملک حسن اختر)' میں اس تاریخ کے مندرجات میں کتب کے ناموں، سنین، مختلف واقعات اور اشعار کی بے شمار اغلاط کے ساتھ ساتھ ادھوری معلومات کے اندراج کی بھی نشاندہی کی ہے(۳۵) لیکن اس تاریخ کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں

ابتدائے اُردو کی بحث بڑی حد سائنٹفک اور جدید لسانیاتی اُصولوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ متذکرہ تاریخ ۱۹۷۹ء میں یونیورسٹی بک ایجنسی انار کلی لاہور سے چھپی۔ اس کا باب اول اُردو زبان کے مختلف ناموں اور اُردو زبان کی ابتدا کے موضوع پر ہے۔ ملک حسن اختر نے آغاز میں ہی لسانی اختلاط کے نظریے کو باطل ٹھہرایا ہے۔ اس معاملے میں وہ دیگر مورخین سے مختلف ہیں۔ لکھتے ہیں:

"دوسری دلیل کہ اُردو ایک ملی جلی بولی ہے اور لشکر میں مختلف گروہوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے، تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ اول تو یہ کہنا کہ اُردو کا استعمال صرف لشکر تک محدود تھا مضحکہ خیز ہے۔ دوسرے زبانوں کے بننے کا یہ طریق نہیں جہاں دو گروہ اکٹھے ہوئے ایک تیسری زبان وجود میں آ گئی۔ لسانی انقلابات بڑے وسیع پیمانے پر اور نہایت دھیمی رفتار سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ خیال کہ دیسی اور بدیسی بھاشاؤں کا ملاپ غوری عہد میں ہوا ہوگا، عدم واقفیت پر مبنی ہے۔"(۳۶)

ملک حسن اختر نے اپنی تاریخ میں اُردو کی ابتدا سے متعلق تمام بحث میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں داخلے سے اُردو کی ابتدا ہوئی یا مسلمانوں کی زبانوں اور مقامی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ اُردو ہے۔ انھوں نے ایک ماہر لسانیات کی طرح پہلے تو اُردو کا آریائی پس منظر واضح کیا ہے۔ اس کے بعد مقامی اپ بھرنش کی اہمیت اُجاگر کی ہے اور پھر تاریخی حقائق کی طرف آتے ہوئے بڑی احتیاط سے حافظ محمود شیرانی سے اتفاق کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

"اُردو کے اولین نقوش پنجاب میں تیار ہوئے اور پھر اُردو مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں آئی جہاں اس نے دہلی کے گردونواح کی بولیوں اور پنجابی کے اثرات کے تحت ایک نئی شکل اختیار کی جسے ہم اُردو کہہ کر پکارتے ہیں۔"(۳۷)

واضح رہے کہ نئی شکل اختیار کرنے اور نئی زبان کی بنیاد پڑنے میں فرق ہے۔ اس فرق کو مورخین کی اکثریت نے ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ وقت کا دھارا اور اہم تاریخی موڑ کسی زبان پر ایسے اثرانداز ضرور ہوتے ہیں کہ اُس کی پرانی شکل کو نئی شکل دے دیں لیکن یہ قطعاً غلط فہمی ہے کہ ایسے اثرات سے ایک نئی زبان جنم لے لے۔ جدید لسانیات کی رُو سے زبانوں کا انسانوں کی طرح نہ ملاپ ہوتا ہے اور نہ ہی جنم، اسی لیے اُن کا جنم دن متعین کرنا بے وقوفانہ فعل ہے۔ زبانیں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ نئی ارتقاپذیر شکل میں ابھرتی ہیں۔

اس موقف کی اُردو کے ایک جید ماہر لسانیات ڈاکٹر گیان چند جین (۱۹۲۳ء۔۲۰۰۷ء) نے توثیق کی ہے اور اس موقف کے بنیادی حوالے شوکت سبزواری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں ان کی دو باتوں کو قابل قدر اُصول سمجھتا ہوں،

پہلی یہ کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو جوڑ کر اور زبان وضع نہیں کی جاسکتی اور دوسری یہ کہ زبان بیک وقت بھی وجود میں نہیں آتی، اس میں ارتقاء ہوتا ہے، اور اس کے ابھار اور نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جاسکتی (۳۸)۔ گو کہ گیان چند جین کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب کے عنوان سے شائع ہونی والی کتاب نے اُردو حلقوں میں اُن کی علمی شخصیت کو خاصا متنازع بنا دیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں تحقیق، تدوین، تاریخ اور لسانیات کے حوالے سے ان کی علمی خدمات آج بھی گراں قدر ہیں۔ گیان چند جین نے دکنیات کے حوالے سے نامور محقق ڈاکٹر سیدہ جعفر کے ساتھ مل کر تاریخ ادبِ اُردو۔ ۱۷۰۰ء تک پانچ جلدوں میں لکھی جو ۱۹۹۸ء میں قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تاریخ کی جلد اول میں انھوں نے اُردو کے آغاز اور ارتقا سے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے دوٹوک الفاظ میں محمد حسین آزادؔ اور حامد حسن قادری کے اس موقف کی تردید کی ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی اور بتایا ہے کہ اُردو اور برج بھاشا میں متعدد اختلافات ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ اُردو میں 'آ' کا لہجہ غالب ہے اور برج میں 'او' کا، اُردو کو تشدید سے عار نہیں جب کہ برج میں یہ شاذ ہے اور دونوں کے صرفی اُصول و ضمائر وغیرہ میں کافی فرق ہے (۳۹)۔ اسی طرح آگے چل کر وہ اُردو اور پنجابی کے تعلق کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کے نظریے کو بھی رَد کرتے ہیں اور مسعود حسین خان اور شوکت سبزواری سے اتفاق کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پنجابی اور اُردو کے آپس میں صرفی اور نحوی اختلافات موجود ہیں (۴۰)۔ جس زبان کے ساتھ وہ اُردو کا حقیقی رشتہ قائم کرتے ہیں وہ کھڑی بولی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "گریرسن نے اس ورنا کیولر کو ہندوستانی کہا۔ چٹرجی نے جس ہندی کی پانچ قسمیں کیں وہ ہندوستانی کھڑی بولی ہی کی قسمیں ہیں۔ عام طور سے اسٹینڈرڈ ہندی ہندوستانی کھڑی بولی سے جدا نہیں۔ دیہاتی بول چال اس کا ایک مخصوص اور محدود رُوپ ہے۔ نجانے کیوں ڈاکٹر مسعود حسین خان کھڑی بولی کو محض اس کے دیہاتی روپ کے معنی میں ہی لیتے ہیں اگر وہ اسے بول چال کی ہندوستانی کے معنی میں لیں تو اُردو اس کی ایک فصیح ادبی شکل ٹھہرتی ہے۔"(۴۱)

اُردو کے حوالے سے بہت سے شبہات اس لئے بھی فروغ پا گئے کہ اس کے دخیل سرمایہ الفاظ کا تعلق ایسی زبانوں سے ہے جن کا ماخذ اُردو کے ماخذ سے یکسر مختلف ہے لیکن چونکہ گیان چند جین ان ماہرین لسانیات میں سے ہیں جو ذخیرۂ الفاظ سے زیادہ زبان کے صرفی و نحوی ڈھانچے کو اہمیت دیتے ہیں اس لئے وہ ایسے عام نظریات کو تسلیم نہیں کرتے جو لفظیات کی بنا پر اُردو کی ابتدا سے بحث کرتے ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

"دخیل سرمایہ الفاظ کو نظر انداز کر کے کھوجنا یہ چاہیے کہ کسی زبان کا بنیادی ڈھانچا کس قدیم زبان کا ارتقاء یافتہ روپ ہے، اس میں متفرق الفاظ دوسری زبانوں یا بولیوں سے لئے گئے تو ان کی اہمیت نہیں۔ اُردو کھڑی بولی ہی کا ایک روپ ہے ۔ ہریانی اور برج کی کچھ خصوصیات بشمول کے باوجود یہ بولیاں اس کے شجرہ نسب میں آتیں۔ یہ اُردو کی آس پاس یا دور کی رشتے دار ہیں آباؤاجداد نہیں۔"(۴۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے گیان چند جین کا نقطہ نظر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مسعود حسین خان سے بھی اختلاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ ادبی رُوپ اور تقریری رُوپ کے الگ الگ ہونے کا مطلب ماخذات بدل جانا نہیں۔ زبان اور ماخذ ہر دو شکلوں میں ایک ہی رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہریانی اور کھڑی بولی کو ایک ہی سمجھتے ہیں اور اُردو کو کھڑی بولی کا ارتقا یافتہ رُوپ قرار دیتے ہیں۔ متذکرہ تاریخ میں اُردو کی ابتدا کے حوالے سے گیان چند جین کی بحث لسانیاتی اعتبار سے نہ صرف اہم ہے بلکہ متقدمین سے کہیں زیادہ مبنی بر تحقیق و تجزیہ بھی ہے۔

رواں صدی میں اب تک اُردو ادب کی دو قابلِ ذکر تواریخ منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ پہلی ڈاکٹر تبسم کاشمیری (پ: ۱۹۴۰ء) کی اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک ہے جو ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے باب اول میں فاضل مورخ اُردو کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کے نظریے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ لاہور کے مسلم سلطنت کا مرکز بننے سے لے کر فتحِ دہلی کے دورانیہ میں ہی اُردو کا ہیولی پنجاب میں تیار ہوا۔ لکھتے ہیں:

" ترکی، عربی، فارسی، پنجابی اور مقامی اپ بھرنش کے باہمی ملاپ سے زبان کا ایک ایسا اسلوب تیار ہونے لگا جو مقامی آبادی اور نئی آبادکاریوں کے لئے نیا ذریعہ اظہار بنتا گیا یہ سماجی ضروریات کو پورا کرنے والا ذریعہ اظہار تھا اس کی ابتدائی ساخت میں طویل مدت صرف ہوئی۔ پنجاب پر غزنوی حکومت کے قیام ۱۰۲۱ء سے لے کر دلی کی فتح (۱۱۹۳ء) تک یہ عمل برابر جاری رہا۔"(۴۳)

اسی باب میں ایک جگہ انھوں نے یہ لکھ کر کہ اُردو زبان کی ابتداء، تشکیل اور ارتقاء میں فوجی مہمات کا گہرا دخل ہے اور یہ کہ اس زبان کا لسانی سفر ان فوجی مہمات کے زیر سایہ طے ہوتا ہے(۴۴) بالکل واضح کر دیا ہے کہ وہ اس خطے میں مسلم لشکر کی آمد کو اُردو کی ابتدا کا بنیادی محرک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح دکنی زبان میں موجود پنجابی صوتیات اور مارفالوجی کے اثرات بھی ڈاکٹر تبسم کاشمیری کو حافظ محمود شیرانی کا نظریہ درست تسلیم کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود انھوں نے اُردو کے آریائی پس منظر اور اس کی تشکیل میں بالخصوص مقامی پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کے کردار سے

انکار نہیں کیا۔ یہ احتیاط ہی اس موضوع کی نزاکت پر اُن کے ایقان کا ثبوت ہے۔ رواں صدی کے دوسرے اہم مورخ ڈاکٹر وہاب اشرفی (۱۹۳۶ء۔ ۲۰۱۶ء) ہیں۔ اُن کی کتاب تاریخ ادبِ اُردو: ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک تین جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ ۲۰۰۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں بھی باب اول اُردو کی ابتدا کے موضوع پر ہے لیکن وہاب اشرفی نے اس پر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا اور جو کچھ لکھا ہے اُس میں بھی وہ خود اُلجھاؤ کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ جمیل جالبی صاحب کی طرح پاکستان و ہند کے ہر علاقے اور وہاں کی زبان کو اُردو کی تشکیل میں حصہ دار قرار دینے کے خواہش مند ہیں جو ظاہر ہے کہ ممکن نہیں، سوانھوں نے بیشتر مورخینِ ادب کی طرح اُردو کو مخلوط زبان کہنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اُردو کے ماخذ کے ضمن میں وہ مسعود حسین خان کے نظریے سے متاثر ہیں اور کھڑی بولی کو ہی اُردو کی بنیاد قرار دیتے ہیں (۴۵)۔ اُن کے خیال میں کھڑی بولی مغربی ہندی کی ایک بولی ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کی زبانوں کے اختلاط سے اُردو وجود میں آئی۔ اُن میں اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری میں فرق صرف یہ ہے کہ مقامی بولی کے ساتھ مسلمانوں کی عربی، فارسی اور ترکی کے ملاپ سے تیار ہونے والے ہیولی کا مرکز تبسم کاشمیری نے پنجاب کو سمجھا تھا جبکہ وہاب کاشمیری دہلی اور اس کے گردونواح کو سمجھتے ہیں۔

یہاں تک اُردو میں لکھی گئی چودہ نمایاں تواریخِ ادب میں ابتدائے اُردو کے مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تمام مورخین کے ہاں ایک مشترک بات یہ سامنے آتی ہے کہ وہ تحقیق میں بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر علاقائی یا مذہبی تشخص سے بالاتر نہیں ہو پاتے۔ خاص طور پر تقسیمِ ہند کے بعد لکھی جانے والی تواریخِ ادب پر غور کیا جائے تو سرحد کے اِس طرف کے پاکستانی مورخین ہر صورت میں اُردو کی ابتدا کا سہرا پنجاب یا سندھ یا اس خطے کے سر باندھنے پر مصر نظر آتے ہیں جہاں مسلمان بادشاہوں نے فتحِ دہلی (۱۱۹۳ء) سے پہلے قیام کیا، دوسرا یہ کہ مسلمان مورخین بہر صورت ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو ہی اُردو کی بنیاد گردانتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ لسانی اختلاط کا نظریہ اُن سب کے ہاں مشترک ہے۔ سرحد کے اُس پار کے ہندوستانی مورخینِ ادب میں سے بھی بیشتر اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبانوں اور مقامی زبانوں کے لسانی اختلاط کا نتیجہ ہی قرار دیتے ہیں لیکن اُن کا زور اُردو کی ہندوستانی بنیاد پر بھی ہے یعنی وہ اس زبان کا ماخذ ہندوستان کی سرزمین اور بالخصوص دہلی اور نواحِ دہلی میں تلاش کرنے پر مصر نظر آتے ہیں۔ اصل میں مورخینِ ادب کا اصل موضوع ادب کی تاریخ ہوتا ہے نہ کہ زبان کی تاریخ، اس لیے وہ لسانیاتی اُصولوں کو خاطر میں لائے بغیر سیاسی پس منظر ذہن میں رکھتے ہوئے زبان کی تاریخ لکھ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر گیان چند جین کی آوازیں اس شور میں بالکل الگ اِس لیے سنائی دیتی ہیں کہ وہ ماہرینِ لسانیات ہیں اور لسانیاتی اُصولوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کے ساتھ جوڑ کر زبان کی ابتدا سے بحث کرتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ متذکرہ دونوں مورخین زبان کی ''پیدائش'' کی

بجائے اس کی "ارتقائی شکل تشکیل پانے" پر یقین رکھتے ہیں۔اُن کا یہ خیال لسانیاتی اعتبار سے بالکل درست ہے کہ زبان انسانوں کی طرح دو لوگوں کے ملاپ سے تولد پذیر نہیں ہوتی۔اُردو خالصتاً ہندوستانی زبان ہے جس کا ماخذ دہلی اور اس کے نواح کی وہ بولی ہے جس کے شستہ رُوپ کو کھڑی بولی اور دیہاتی رُوپ کو ہریانی کا نام دیا جاتا ہے۔اُس زبان کی قدیم شکل جو بھی تھی اُس میں ارتقا وقت کے ساتھ ساتھ تاریخی اصولوں کے تحت ضرور ہونا تھا گویا مسلمان ہندوستان پر قابض نہ بھی ہوتے تو اُس کھڑی بولی کی ارتقائی شکل آج مختلف ہوتی۔یہ الگ بات ہے کہ وہ شکل کیا ہوتی۔انشااللہ خان انشا نے رانی کیتکی کی کہانی لکھ کر غالباً اُسی جدید شکل کا ایک اسلوب دکھانے کی کوشش کی تھی۔بہر کیف مسلمانوں کے یہاں آنے سے عربی، فارسی اور ترکی کے اثرات سے اُس زبان کی وہ شکل تشکیل پائی جسے ہم آج اُردو کہتے ہیں۔یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اُردو کی یہ نکھری ہوئی شکل آٹھ سو یا ہزار سال پہلے نہیں بلکہ لگ بھگ تین ساڑھے تین سو سال پہلے ظاہر ہوئی اور اس کے آریائی پس منظر سے کسی بھی سنجیدہ محقق کو انکار نہیں۔

حوالہ جات /حواشی:

۱۔ سحر انصاری، پروفیسر، مقالاتِ عبدالستار صدیقی، مشمولہ: قومی زبان (کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، جولائی ۲۰۱۸ء) جلد نمبر ۹۰، شمارہ نمبر ۷، ص۵

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: آغاز سے ۲۰۱۰ء تک (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص۴۷

۳۔ سلمان احمد، اُردو کی ادبی تاریخیں (نظری مباحث)، مرتبہ (حیدر آباد: قصر الادب ۱۹۹۹ء)، ص۹

۴۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادبِ اُردو (ملتان: المضراب پبلشرز، ۲۰۰۵ء)، ص۶۳

۵۔ اعجاز حسین، سید، مختصر تاریخِ ادبِ اُردو (الٰہ آباد: انڈین پریس لمیٹڈ، ۱۹۴۰ء) بار دوم، ص۱۔۲

۶۔ ایضاً، ص۷

۷۔ علی اصغر چشتی، مولانا، جواہرِ فریدی (لاہور: وکٹوریہ پریس، ۱۳۰۱ھ)، ص۲۰۸

۸۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۹۸ء) طبع دوم، ص۲۳۶

۹۔ اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: آغاز سے ۲۰۱۰ء تک، ص۴۷

۱۰۔ ایضاً، ص۹۸

۱۱۔ ایضاً، ص۸۳-۸۴

۱۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو، جلد اول، قدیم دور ابتدا سے ۱۷۵۰ء تک (دہلی: ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء)، ص ۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۔۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۔۱۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۔۸

۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ (لاہور، عزیز بک ڈپو، ۲۰۱۴ء)، ص ۴۷۔۴۸

۱۷۔ نور الحسن نقوی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو (علی گڑھ: ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۳۔۱۴

۱۸،۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۰۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند: آغاز سے معاصرین ولی تک (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء)، جلد اول، ص ۳۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۷۔۳۸

۲۲۔ آزادؔ، محمد حسین، آبِ حیات، (ملتان: شعبہ اُردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۶ء)، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ص ۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۴، ۲۵۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخِ اُردو (آگرہ: لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب، ۱۹۴۱ء)، ص ۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۷۔ علی جواد زیدی نے اپنے مضمون 'تاریخ ادبِ اُردو کی تدوین' میں بتایا ہے کہ رام بابو سکسینہ کی انگریزی تصنیف ۱۹۲۴ء میں اور اس کا اُردو رُوپ ۱۹۲۷ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ [بحوالہ: ادبی تاریخ نویسی، مرتبہ: ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء)ص ۴۱]۔ جبکہ پروفیسر آلِ احمد سرور نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے یہ تاریخ ۱۹۲۷ء میں لکھی۔ [بحوالہ: تمہید، مشمولہ: علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو، پہلی جلد (علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء) طبع اول، ص ا]

۲۸۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادبِ اُردو (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء) ترجمہ: مرزا محمد عسکری، ص ۲۶

۲۹۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، لسانیاتی مقدمہ، مشمولہ: علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو (علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء)، ص ا

۳۰۔ ایضاً، ص ۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۶

۳۲،۳۳۔ ایضاً، ص ۳۹

۳۴۔ آلِ احمد سرور، پروفیسر، تمہید: مشمولہ: علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو (علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء)، ص ھ

۳۵۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو (ڈاکٹر ملک حسن اختر)، مشمولہ :اُردو ادب کی تاریخیں: تنقید و تجزیہ، مرتب: ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی (لاہور :عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۹۱ تا ۲۹۶

۳۶۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو (لاہور: یونیورسٹی بک ایجنسی انار کلی، ۱۹۷۹ء)، ص ۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۲

۳۸۔ سیدہ جعفر، گیان چند جین، تاریخ اُردو ادب: ۱۷۰۰ء تک (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ستمبر ۱۹۹۸ء)، ص ۷۱۔۷۲

۳۹۔ ایضاً، ص ۷۳۔۷۴

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۸

۴۱۔ ایضاً، ص ۸۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۸۵

۴۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ: ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۰

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۲۔۲۳

۴۵۔ وہاب اشرفی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو: ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء) جلد اول، ص ۲۷